جدید اسلامی فکر پر استشراقی اثرات-۲

مالک بن نبی ○

یہ بات واضح ہے کہ مستشرقین کی دونوں طرح کی تحریریں مسلم معاشرے کے حق میں بُری ثابت ہوئیں، کیونکہ انھوں نے اُمہ کے ذہن میں محرومی کا احساس بھر دیا۔ خواہ وہ مدح سرائی یا قصیدہ خوانی کی شکل ہی میں ہو۔ اس چیز نے موجودہ حقائق پر غوروفکر سے ہٹا کر، ہمیں شان دار ماضی کی خیالی جنّت میں پہنچا دیا۔ ہم پر اس طرح نکتہ چینی کی گئی اور ہمیں یوں بے قیمت ثابت کیا گیا کہ ہم موحدین کے بعد کے زوال پذیر معاشرے کے محافظ تصور کیے جانے لگیں۔ اس صورت میں ہمارا فرض یہ ہے کہ ہم اسلامی نقطۂ نظر کے تحت مستشرقین کی تحریروں کو علم وعقل کی کسوٹی پہ پرکھیں اور اسلامی حقیقت کو واضح کریں۔ اس لیے کہ اسلامی حقیقت کی وضاحت یا دفاع کا حق اور ذمہ داری مسلمانوں پر ہی ہے۔

اگر اس استشراق کا کوئی مثبت پہلو ہے، تو وہ اسلامی فکر کی قصیدہ خوانی نہیں بلکہ اس پر ٹھوس تنقید کی صورت میں ہے۔ اس لیے کہ جب استشراق کی طرف سے یہ دعویٰ کیا جائے گا کہ ''عربوں نے سائنسی علوم میں کوئی حصّہ نہیں لیا'' تو ہوسکتا ہے، اس کی تلافی سطحی علمیت سے کی جائے جیسا کہ طنطاوی جوہری نے تفسیر میں کیا ہے۔ لیکن مثبت اور ٹھوس تنقید کے نتیجے میں اس بات کا قوی امکان ہے کہ اسلام کے مخالفین شدت پسندی اور حقیقت سے انکار کی بنا پر، اسلام اور

○ مالک بن نبی (۱۹۰۵ء-۱۹۷۳ء) مشرقی الجزائر میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۳۱ء میں فرانس سے الیکٹریکل انجینیرنگ کی ڈگری لی۔ ۱۹۵۶ء سے الجزائر کی آزادی کے لیے، فرانسیسی سامراجیوں کے خلاف جدوجہد میں بھرپور حصّہ لیا۔ بیسویں صدی کے اہم ترین اسلامی مفکرین میں شمار ہوتے ہیں۔ عربی سے ترجمہ: ڈاکٹر ظفرالاسلام خان، ایڈیٹر دی ملّی گزٹ

سائنس کا مسئلہ ایک نئی شکل میں پیش کیا جائے، جو دین کے بلند مقام اور سائنس کی منطق سے زیادہ قریب ہو۔ قرآنی آیات میں کوئی خلا کو ڈھونڈنے یا ایٹمی توانائی کے تجزیے کا مفہوم تلاش کرنے کے بجاے، ہمارے سامنے اصل سوال یہ ہونا چاہیے کہ کیا قرآنی آیات کی روح سائنسی عمل کی راہ میں رکاوٹ بنتی ہے یا اس کی ہمت افزائی کر کے اسے ترقی دیتی ہے؟

یہ سوال بھی توجہ چاہتا ہے کہ کیا قرآن کسی معاشرے میں سائنسی ترقی کے لیے سازگار فضا قائم کرسکتا ہے؟ اور کیا وہ سائنسی علوم کو قبول کرنے اور انھیں دوسروں تک پہنچانے کے لیے لازمی ذہنی صلاحیتیں بیدار کرسکتا ہے؟

اس ضمن میں ہمیں نفسیاتی اور سماجی پہلو سے مسئلے کو پیش کرنا چاہیے، نہ کہ سائنسی علوم کی ترقی کے پہلو سے۔ اگر ہم اسلامی فکر کو اس پہلو سے صحیح ثابت کرسکیں تو اس کے کھاتے میں ان دو انکشافات کو درج کرسکتے ہیں، جن کے بغیر بیسویں صدی کی سائنسی ترقیات کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ آج نیوکلیائی سائنس کے باب میں جو حیرت انگیز ترقی ہوئی ہے، کیا طبیعیات کے ماہرین اسے ریاضی کے قواعد اور الیکٹرانک کیلکولیٹر کے بغیر حاصل کرسکتے تھے؟ اور کیا یہ آلات اعشاری نظام کے بغیر اپنا عمل جاری رکھ سکتے تھے، جس کے ذریعے ہم مثلاً ایوگیڈرو نمبر [1] کے صرف پانچ یا زیادہ صحیح یہ کہ سات نمبروں کو لکھ سکتے ہیں؟ کیا ریاضی کا یہ حیرت انگیز نظام اس ذہنی فضا کا ثمر نہیں ہے، جو اسلامی معاشرے میں قرآنی تعلیمات نے قائم کی تھی؟

یہاں ہم ریاضیات کی ترقی میں 'الجبرا' کے کردار پر بھی سوال اُٹھائیں گے، جس نے مادی اعداد کے علم کو خالص رُموز و علامات کا علم بنا دیا۔ 'الجبرا' کا لفظ ہی اس کے عرب ماخذ کی نشان دہی کے لیے کافی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسانی عقل، اسلامی دانش کی اس معنی میں احسان مند ہے کہ اس نے ایک ایسا ذریعہ دیا، جس کے بغیر انسانیت ریاضیاتی سائنس کے میدان میں ترقی نہیں کرسکتی تھی۔ ہمیں اس کی فکر نہیں کہ فرید وجدی کی طرح مستشرقین کے کاسہ لیس شاگردوں نے بغیر کسی دلیل و ثبوت کے 'الجبرا' کو یونانی فلسفی دیوفانتوس کی طرف منسوب کر دیا، بلکہ اصل اہمیت اس بات

---

[1] ایوگیڈرو (Avogadro) نمبر کیمسٹری کا ایک پکا نمبر ہے (یہ ایک اطالوی سائنس دان کے نام پر رکھا گیا ہے) جن کے ذریعے کسی مادہ میں ایٹموں یا مالیکیولز کی تعداد کا تعین کیا جاتا ہے۔ (مترجم)

کی ہے کہ 'الجبرا' کا علم اس ذہنی فضا میں پیدا ہوا تھا، جو قرآن نے قائم کی تھی۔ لیکن یہ بھی ایک بے معنی اور طفلانہ حرکت ہوگی کہ سائنسی علوم کی ترقی کی نشان دہی کرتے ہوئے ہم اعشاری نظام اور 'الجبرا' کو قرآنی آیات سے مربوط کر دیں۔

حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم میں براہِ راست اعشاری نظام یا 'الجبرا' کا ذکر نہیں ہے، لیکن قرآن نے ایک ایسی نئی ذہنی فضا ضرور قائم کر دی، جس میں سابقہ یونانی اور رومی دور کی طرح سائنسی علوم ترقی کی راہ پر گامزن ہو گئے۔ سائنسی ترقی کو صرف سائنس کی کامیابیوں میں نہیں دیکھنا چاہیے، بلکہ اسے ان تمام ذہنی اور سماجی حالات کے پس منظر میں دیکھنا چاہیے، جن سے ایک مخصوص ماحول تشکیل پاتا ہے۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ ہر دور میں عقل کی دل چسپی کے مراکز ذہنی فضا کی تبدیلی کے اعتبار سے بدلتے رہتے ہیں۔

ہم تاریخی اعتبار سے صنعت اور صنعت کاری کو ڈونیس ہیبان کے انکشاف سے مربوط کر سکتے ہیں، جس نے آگ پر رکھی ہوئی کیتلی کے ڈھکن کو بھاپ سے اُوپر نیچے ہوتے دیکھ کر اتفاقیہ طور پر اسٹیم کی طاقت دریافت کر لی تھی۔

لیکن ہمیں یہاں اس بات پر غور کرنا چاہیے کہ آگ کے انکشاف کے لمحے سے لے کر یہ اتفاق تمام انسانی نسلوں میں پیش آتا رہا تھا، لیکن ہیبان کے دور تک کوئی شخص بھی بھاپ کی طاقت کا انکشاف نہ کر سکا۔ ایسا کیوں تھا؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ ڈونیس ہیبان یا انگریز موجد واٹ اپنے تجربات اور جائزوں کو اس نئے ذہنی ماحول میں پروان چڑھا رہے تھے، جو یورپ میں دو صدی پہلے سے قائم تھا، جب ڈیکارٹ نے میتھڈ پر اپنی مشہور کتاب میں اس طرح پیش گوئی کی تھی:

> ایسے علم کا حصول ممکن ہے جس کی زندگی میں نفع بخش طریقے سے تطبیق کی جا سکے۔ اس طرح درس گاہوں کو تصوراتی فلسفہ ترک کر کے ایسے فلسفے کی تعلیم دینا چاہیے، جو تطبیق کے قابل ہو۔ آگ، ہوا، اجرامِ فلکی، اور آسمانوں اور ہماری زمین کے اردگرد جو سیارے ہیں، ان سب کے بارے میں معلوم کر کے ہمیں یہ موقع فراہم کرے، کہ خود ان کے قانون کے تحت اسے اپنے ذاتی فائدے کے لیے استعمال کر سکیں، تاکہ ہم فطرت کی قوتوں پر قابو پا کر انھیں زیر استعمال لا سکیں۔

یہ عبارت واضح طور پر ڈیکارٹ کے بعد آنے والے سائنس اور ٹکنالوجی کے انقلاب کی پیش گوئی اور اس راہ کی نشان دہی کر رہی ہے، جسے سودمند علمی حقیقت کی تلاش کے لیے یورپی فکر نے اختیار کیا۔ یہ ضروری تھا کہ اس راہ پر چل کر یورپی فکر کو اسٹیم کی طاقت ملتی، خواہ اس کا انکشاف کرنے والا ڈوینس پیپان ہوتا یا کوئی اور۔

اس طرح ڈیکارٹ کے اسلوب اور قاعدے (میتھڈالوجی) نے وسیع پیمانے پر وہ ذہنی ماحول تشکیل دیا، جس میں فائدے کی متلاشی عقلی توانائیاں پروان چڑھیں، جو نئی تہذیب کی علامت ہیں۔

● **سائنس کیا ہے؟** یہی وہ مقام ہے، جہاں ہم اسلام اور سائنس کے عمومی تعلق کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ اس لیے کہ مظاہرِ قدرت کی دنیا کے مقابلے میں ایک مسلمان قرآنی متن کے زیر اثر اسلامی ذہن سے اپنے لیے جو راہ اختیار کرے گا، اور جس نئے عقلی ماحول میں یہ ذہن ترقی کرے گا، یہ سب درحقیقت مسئلے کے مختلف بنیادی پہلو ہیں۔

سائنس بذاتِ خود معلومات کا اور اسے حاصل کرنے کے طریقوں کے مجموعے کا نام ہے۔ لیکن اس تعریف میں جو ہم نے سائنسی ترقی کی تاریخ کے نقطۂ نظر سے کی ہے، کچھ اور اضافہ کرنا ہوگا۔ کیونکہ سائنسی ترقی صرف اسی گوشے تک محدود نہیں ہے، بلکہ اس کے لیے متعدد ذہنی اور سماجی شرائط لازم ہیں، جو منفی یا مثبت طریقے پر اثرانداز ہوتی ہیں۔ اس طرح کہ وہ یا تو اس کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ بنیں گی یا اسے زیادہ سے زیادہ مواقع فراہم کریں گی۔

اس کو اس طرح سمجھا جاسکتا ہے کہ جب گلیلیو نے سورج کے گرد زمین کے گھومنے کا نظریہ پیش کیا، تو اسے کسی علمی مخالفت کا نہیں بلکہ مخصوص مذہبی عقائد کے اختلاف کا سامنا کرنا پڑا۔ گلیلیو کو کسی سائنسی اکیڈمی نے مجرم قرار نہیں دیا تھا، بلکہ ایک مذہبی عدالت نے عیسائی عقیدے کے تحفظ کے نام پر مجرم قرار دیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ گلیلیو کو جبر و محرومی کے متعدد عوامل نے مجرم قرار دیا تھا جو اسے موت کی سزا سنانے والے اس معاشرے کی ذہنیت میں جمے ہوئے تھے۔

اس بات کی حقیقت اور مفہوم کو سمجھنے کے لیے ہمیں ڈیکارٹ سے پہلے کے اس یورپی معاشرے کو دیکھنا ہوگا، جس نے فلکیات کے ایک بڑے سائنس دان کو موت کی نیند سلا دیا تھا۔ اس معاشرے میں [ستاروں کا علم رکھنے کا دعویٰ کرنے والے] نجومی کو ایک اہم ترین مشیر کا مقام

حاصل تھا، جیسے تھوسٹراڈ موسی جو فرانس کے ایوانِ شاہی میں ملکۂ کاترینا کا مشیر خاص تھا۔

اس امر کی مزید وضاحت کے لیے یہ بتانا ضروری ہے کہ اگر یہ گلیلیو، ایک مسلم معاشرے میں زندگی گزار رہا ہوتا (باوجود یکہ اس دور میں مسلم تہذیب رُوبہ زوال تھی) تو اسے ان حالات کا سامنا نہ کرنا پڑتا، جو اس کی علمی تحقیق کی راہ میں رکاوٹ بنے اور نتیجے کے طور پر اسے اپنی زندگی سے ہاتھ دھونا پڑا۔ تیسری صدی ہجری کے اوائل میں اس دور کے ایک بڑے ملحد اسحاق ابن الراوندی [م:۹۱۱ء] نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کرتے ہوئے کہا تھا:

لَقَدْ تحجر عَرِيضًا اِبْنِ اَبِیْ كَبْشَةَ حِيْنَ ادَّعٰى اَنَّهٗ خَاتَمَ الْاَنْبِيَآء (ابن ابی کبشہ نے کس ہٹ دھرمی سے آخری نبی ہونے کا دعویٰ کیا ہے)

سب کو معلوم ہے کہ یہاں 'ابن ابی کبشہ' سے کون مراد ہے؟ اسلام کی عظیم ترین ہستی کی شان میں گستاخی کے باوجود ابن الراوندی پر مقدمہ چلانے اور اسے مجرم قرار دینے کے لیے کوئی مذہبی عدالت نہیں لگائی گئی، تاہم اسے اپنی گستاخی کا نتیجہ خود بھگتنا تھا۔ اس نے مکہ کی طرف جاتے ہوئے راستے میں خودکشی کر لی۔

اسی طرح قرآن کے بارے میں اندلس کے ایک یہودی کی دریدہ دہنی کے خلاف ابن حزم نے بڑا مؤثر جواب دیا تھا، جو رسالۃ ابن التجریلۃ کے نام سے مشہور ہے۔ ایسے سخت رو واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ اس نئے ذہنی ماحول میں، جب اسلامی معاشرہ دنیا کے لیے ایک اعلیٰ نمونہ اور مثالی معاشرہ تھا، فکروخیال کی آزادی کو زبردستی ختم نہیں کیا جاتا تھا۔

اسلامی تاریخ میں فکری جبر کی مثالیں شاذونادر ہی ملیں گی، جیسے مامون الرشید کے دور میں 'خلق قرآن' کا مسئلہ سامنے آیا تھا۔ ان حالات میں بھی بعض اُمور سامنے آتے ہیں، جو فکری جبر کی شدت کے عوامل کو ممکن حد تک کم کر دیتے تھے۔ یہ اُمور اسلامی ضمیر میں قرآنی تعلیمات کے زیر اثر جاگزیں تھے۔ آیئے دیکھیں کہ نزولِ وحی کے بعد سے کیسا ذہنی ماحول تشکیل پا رہا تھا؟

● **نزولِ وحی کے بعد کا ذہنی ماحول:** عہد نامہ قدیم میں باب 'پیدایش' کی ابتدا کائنات کے مادی مظاہر سے ہوتی ہے۔ انجیل یوحنا کے عہدنامہ جدید کی ابتدا تجسیم کے عمل سے ہوتی ہے، جب کہ قرآن کی ابتدا ذہنی پہلو لیے ہوئے ہوتی ہے: اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ، ''پڑھ اپنے

رب کے نام سے''۔ اِقْرَأْ ..... یہ پہلا لفظ ہے جو پہلے اسلامی ضمیر، یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ضمیر پر وارد ہوتا ہے۔ اس کے بعد ہر مسلمان کے ضمیر پر اپنے لیے جگہ بناتا چلا جاتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ الفاظ ہی 'روح' اور پیغام و بیان کا وسیلۂ اظہار ہیں۔ وہ ہر معرفت کے حامل اور علامت ہوتے ہیں۔ نزولِ قرآن کا اوّلین لمحہ اِقْرَأْ کی شکل میں الفاظ کی اہمیت کی نشان دہی، ان کے موضوع کا خصوصی تذکرہ اور اسلامی ضمیر میں ان کی قدر و قیمت کو ثبت کر دیتا ہے۔

لفظ، 'روح' کو منتقل کرنا اور اس کے پیغام کو پہنچانا ہے اور اس کے ساتھ اسے ضائع ہونے سے محفوظ رکھتا ہے۔ یہ لفظ سب سے پہلے خود قرآن کی حفاظت کرتا ہے۔ یہ وہ کتاب ہے جس کا چودہ سو سال سے ایک حرف بھی نہیں بدلا جاسکا۔ اس کے برعکس دورِ قدیم سے دورِ جدید تک کی تمام کتابیں ہیں کہ جن کی تاریخی صداقت کو جدید تنقید، علمی توثیق کے بغیر صرف علامتی حیثیت میں قبول کرتی ہے۔

یہ خصوصیت اس جدید فکر کا پہلا علمی نتیجہ تھی، جو قرآنی فضا میں پروان چڑھی۔ اس ماحول کا آغاز ٹھیک اس وقت ہوا، جب سیّدنا عثمانؓ کے زمانے میں نوخیز اسلامی معاشرے نے قرآنی آیات کو جمع کیا، تاکہ انھیں ضائع ہونے سے بچایا جاسکے اور ان کا اس طرح احاطہ کیا جاسکے کہ کسی قسم کی تبدیلی کی گنجایش باقی نہ رہے۔ سیّدنا زید بن ثابتؓ کی سربراہی میں ایک کمیٹی نے یہ کام انجام دیا تھا۔ درحقیقت منہج (میتھڈ) کے مطابق یہ پہلا علمی کام تھا۔ زیربحث موضوع میں اس کی تفصیلات کا تذکرہ ممکن نہیں، لیکن تدوین قرآن میں جس محنت، احتیاط اور متن کی صحت سے کام لیا گیا ہے، اسے جدید تنقید کی نظر میں قابلِ ستایش ہونا چاہیے۔

درحقیقت یہ فکرِ اسلامی کا ہی نہیں بلکہ اس انسانی فکر کا پہلا علمی کارنامہ تھا، جس نے قابلِ تقلید مثالی شخصیت کے سامنے بے چون و چرا سر جھکا کر اپنی طویل تاریخ میں بارہا ٹھوکریں کھائی ہیں، بلکہ اس جدید دور میں بھی بسا اوقات انسانی فکر کے قدم ڈگمگائے ہیں۔ اس سلسلے میں سوویت یونین [اشتراکی روسی سلطنت] کی مثال دی جاسکتی ہے، جہاں بائیولوجی جدید سائنسی قافلہ سے ۳۰ سال پیچھے رہ گئی کیونکہ لیسنکو نے خود کو قابلِ مثال نمونہ سمجھ لیا تھا۔

تمام انسانی معاشروں کی تاریخ بتاتی ہے کہ انھیں اپنی ذہنی عمر کی ترقی کے مختلف مراحل میں اس طرح کی رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ انسانیت اپنی ذہنی ترقی کے عمل میں عمر کے بالعموم

تین مراحل سے گزرتی ہے:

عمر کے پہلے دور (ایامِ طوفولت) میں وہ اپنے فیصلے 'عالم الاشیاء' (مادی اشیا کی دنیا) کے معیار کے مطابق کرتی ہے۔ اس طرح کہ اس کا معمولی سا فیصلہ بھی ابتدائی ضرورت کے مطابق ہوگا۔

اپنی عمر کے دوسرے دور میں انسانیت کے اپنے فیصلے مثالی نمونے کے اصول و معیار کے مطابق ہوں گے، اور ان کا تعلق 'عالم الاشخاص' (اشخاص کی دنیا) سے ہوگا۔ اس مرحلے میں فکر وخیال تجسیم سے دُور نہیں ہوتا۔ اس کی ساری قیمت اس ذات پر منحصر ہوتی ہے، جو ہماری نظروں میں فکر وخیال کا مجسم نمونہ ہوتی ہے۔

اس کے بعد انسانیت بلوغ کے مرحلے، یعنی اپنی عمر کے تیسرے دور 'عالمِ الافکار' (افکار کی دنیا) میں داخل ہوتی ہے۔ اس وقت افکار کی بذاتِ خود ایک منفرد حیثیت ہوتی ہے۔ اس کے لیے 'عالم الاشیاء' یا 'عالم الاشخاص' میں سے کسی کی توثیق کی ضرورت نہیں رہتی۔

یہاں اس بات پر غور کرنا ضروری ہے کہ انسان جب عقلی پختگی کی عمر کو پہنچ جاتا ہے، تو فکر اپنی قدر و قیمت کی بقا کے لیے اشخاص یا اشیا کی محتاج نہیں رہتی۔ آگے آنے والی ایک قرآنی آیت اس صورتِ حال کو پوری طرح واضح کردے گی۔ ہمیں معلوم ہے کہ اسلامی فکر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے بڑی حد تک مربوط تھی۔ جس معاشرے میں اسلام کی دعوت دی جارہی تھی، اس کی نظروں میں یہ فکر آپؐ کی ذات میں مجسم تھی۔ لیکن قرآنِ کریم چاہتا تھا کہ اس کی آیات اس قید سے آزاد ہوجائیں، تاکہ جدید معاشرہ بھی اس قسم کی تمام قیود سے آزاد ہوجائے، جو علم وفکر کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ بن سکتی ہیں۔ چنانچہ یہ آیت نازل ہوئی:

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۭ اَفَاْىِٕنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓي اَعْقَابِكُمْ ۭ (اٰل عمرٰن ۳:۱۴۴) محمدؐ اس کے سوا کچھ نہیں کہ بس ایک رسولؐ ہیں، اُن سے پہلے اور رسولؐ بھی گزر چکے ہیں، پھر کیا اگر وہ مرجائیں یا قتل کردیے جائیں تو تم لوگ اُلٹے پاؤں پھرجاؤ گے؟

اس آیت کے نزول نے نوخیز معاشرے کو مادی اشیا اور شیئیت (مادہ پرستی) کے دور سے نکال کر فکر کے دور میں پہنچادیا۔

● **علم کی حقیقت:** ہم دیکھتے ہیں کہ نزول اِقْرَأ کے بعد سے اس معاشرے کے نفسیاتی خدوخال میں تبدیلی واقع ہوئی، جس کے نتیجے میں ایک نیا ذہنی ماحول وجود میں آیا۔ اس کے ساتھ اس ماحول پر ایسے تجربات کیے جارہے تھے، تاکہ نوخیز اسلامی ضمیر میں اس کی شکل خوب واضح ہوجائے۔ قرآن سوال کرتا ہے:

هَلْ يَسْتَوِي الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ط (الزمر ۳۹:۹) کیا جاننے والے اور نہ جاننے والے دونوں کبھی یکساں ہوسکتے ہیں؟

مذکورہ آیت جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے سوال کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے، وہ درحقیقت اسلامی ضمیر میں علم کی قدر و قیمت بٹھانے، اور نئے معاشرے میں جاہل کے مقابلے میں اہلِ علم کی فوقیت کا اعلان تھا۔

اگر چند لفظوں میں علم کا مفہوم بیان کیا جائے تو یہی کہا جاسکتا ہے کہ ''ہر میدان میں حقیقت کی تلاش کا نام علم ہے، خواہ وہ اخلاق، قانون اور سماجیات ہوں یا طب وطبیعیات وغیرہ''۔ البتہ اس تلاش کی راہ میں رکاوٹیں پیدا ہوسکتی ہیں اور وہ تلاش بے راہ بھی ہوسکتی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ہم کسی وہم کو حقیقت سمجھ لیں اور خیالات کے جنگل میں بھٹک جائیں۔ بسا اوقات خیالات غلط بھی ہوتے ہیں۔ علم کو ایسے حالات کا سامنا کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیے، جن میں عقل شک ویقین کی کیفیت میں مبتلا ہو۔ اسے ان حالات کے مقابلے کے لیے عقل کو تربیت دینا چاہیے۔

قرآن نے اس پہلو کو نظرانداز نہیں کیا، بلکہ وہ اشارے کنائے میں اس طرف توجہ مبذول کراتا ہے، مثلاً وہ 'حقیقت' اور 'وہم' کا فرق یہودیوں کی بدعنوانی اور گمراہی کے واقعات سنا کر واضح کرتا ہے:

وَمِنْهُمْ اُمِّيُّوْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ الْكِتٰبَ اِلَّآ اَمَانِيَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ۝ (البقرہ ۲:۷۸) ان میں ایک دوسرا گروہ اُمّیوں کا ہے، جو کتاب کا تو علم رکھتے نہیں۔ بس اپنی بے بنیاد اُمیدوں اور آرزوؤں کو لیے بیٹھے ہیں اور محض وہم وگمان پر چلے جارہے ہیں۔

یہاں نفس کا میلان، شک وشبہہ اور محض امکانات بے یقینی کی مختلف کیفیتیں ہیں، جنھیں ہم ایک 'روشن حقیقت' کے بالمقابل نہیں رکھ سکتے کہ جو ذہنی یقین کی واضح ترین شکل کی نشان دہی کرتی ہے۔ پھر دوسری قرآنی آیات میں اس روش کو سخت تنقید کا نشانہ بنایا گیا ہے، جو زیر بحث

موضوع کے تمام پہلوؤں کا جائزہ لیے بغیر ان مسائل پر بحث کرے، جن کا اسے کوئی علم نہیں ہے:

هٰٓاَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ حٰجَجْتُمْ فِيْمَا لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ فَلِمَ تُحَآجُّوْنَ فِيْمَا لَيْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ ط (اٰل عمرٰن ۳:۶۶) تم لوگ جن چیزوں کا علم رکھتے ہو اُن میں تو خوب بحثیں کر چکے، اب اُن معاملات میں کیوں بحث کرنے چلے ہو جن کا تمھارے پاس کچھ بھی علم نہیں۔

یہ قرآنی آیات، اسلامی فکر کو علم کی راہ پر گامزن کرتی ہیں اور حصولِ علم کے لیے اسے بہتر طریق کار کی ہدایات دیتی ہیں۔ اس اعتبار سے قرآن کے نظامِ تعلیم و تربیت کا تفصیلی مطالعہ ضروری ہے۔ تاہم، قرآنی تصور کو حدیث نے عملی طور پر ان احکام کی شکل میں پیش کیا ہے جن کا تعلق براہِ راست مسلمان کی روزمرہ زندگی سے ہے: ''علم کا حصول ہر مسلمان پر فرض ہے''۔ ایسی احادیث، عملی طور پر ان ذہنی بنیادوں کو مزید مستحکم کرتی ہیں، جو فکرِ اسلامی میں قرآن کے زیر اثر قائم ہوئی تھیں، تاکہ یہ اسلامی فکر اپنے علمی، سیاسی اور معاشرتی کردار کو بہتر طریقے پر انجام دے سکے۔

قرآن کے جس نظامِ تربیت نے نئے معاشرے کو عقلی ذمہ داریوں کے لیے تیار کیا تھا، اس کے اثرات فرد کے طریق عمل اور زندگی کے معمول کے مطابق تجربات میں بھی نمایاں نظر آتے ہیں۔ مثال کے طور پر حضرت عمر بن الخطابؓ ایک دن مدینہ کی کسی گلی سے گزرتے ہوئے والہانہ جذبے سے قرآن پڑھتے جارہے تھے۔ اور جب وہ ان آیات پر پہنچے:

اَنَّا صَبَبْنَا الْمَآءَ صَبًّا ۝ ثُمَّ شَقَقْنَا الْاَرْضَ شَقًّا ۝ فَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا حَبًّا ۝ وَّعِنَبًا وَّقَضْبًا ۝ وَّزَيْتُوْنًا وَّنَخْلًا ۝ وَّحَدَآئِقَ غُلْبًا ۝ وَّفَاكِهَةً وَّاَبًّا ۝ (عبس ۸۰: ۲۵-۳۱) ہم نے اُوپر سے پانی برسایا، پھر زمین کو پھاڑا، پھر ہم نے اس میں غلہ، انگور، ترکاری، زیتون، کھجور، گنجان باغ اور میوے اور چارہ پیدا کیا۔

حضرت عمرؓ نے 'اَبًّا' کے لفظ پر توقف کرتے ہوئے محسوس کیا کہ انھیں اس لفظ کے معنی معلوم نہیں ہیں۔ اب آیئے دیکھیں کہ حضرت عمرؓ اس مشکل کو کیسے حل کرتے ہیں؟ حضرت عمرؓ لغت کے عالم نہیں ہیں۔ اس وقت تک یہ علم وجود میں نہیں آیا تھا۔ اس کو کتاب العین کے مؤلف الخلیل بن احمد الفراھیدی نے رائج کیا، جنھیں آج کی اصطلاح میں 'ماہر لسانیات' کہنا چاہیے۔ حضرت عمرؓ مفسر بھی نہیں تھے۔ وہ تو صرف عام انسان تھے، ایک ایسا عملی انسان، جو اپنے دائرۂ کار سے باہر

کے اُمور میں دخل دینا پسند نہیں کرتا۔ اور وہ اس آیت کو پیش نظر رکھتے ہیں:

فَلِمَ تُحَآجُّوْنَ فِيْمَا لَيْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ ط (اٰلِ عمرٰن ۳:۶۶) اُن معاملات میں کیوں بحث کرنے چلے ہو جن کا تمھارے پاس کچھ بھی علم نہیں۔

ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے اس لفظ پر چند لمحے توقف کیا، کہ ایک لفظ کے معنی کی ناواقفیت مومن کے ضمیر کے لیے آیت کے مفہوم کی راہ میں رکاوٹ نہیں بنتی۔ حضرت عمرؓ کے نزدیک اس وقت مسئلے کا تعلق علم کے دائرے سے نہیں بلکہ طریقِ عمل سے تھا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ انھوں نے خود اپنی سرزنش کر کے اس مسئلے کو حل کر لیا۔ انھوں نے کہا: ''عمر کا اَبّا سے کیا تعلق؟ اَبّا سے ناواقفیت ہے تو کیا ہوا؟ عمر! یہ اپنے آپ کو خواہ مخواہ مشقت میں ڈالنا ہے''۔ اس کے بعد حضرت عمرؓ اپنے معاملات کی طرف متوجہ ہو گئے، جہاں بڑی بڑی ذمہ داریاں ان کی منتظر تھیں۔

اسی طرح ایک بار حضرت عمرؓ نے عورت کے مہر کی حد مقرر کرنا چاہی، اس لیے کہ ان کے خیال میں وہ مناسب مقدار سے زیادہ وصول کیا جا رہا تھا۔ لیکن اس وقت ایک عورت نے یہ کہتے ہوئے ان کی مخالفت کی: ''اے عمرؓ! اللہ نے آپ کو اس کا حق نہیں دیا'' اور پھر اس عورت نے یہ آیت پڑھی:

وَاِنْ اَرَدْتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ ۙ وَّاٰتَيْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَيْـًٔا ط اَتَاْخُذُوْنَهٗ بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا ۝ (النساء ۴:۲۰) اور اگر تم ایک بیوی کی جگہ دوسری بیوی لے آنے کا ارادہ ہی کر لو، تو خواہ تم نے اسے ڈھیر سا مال ہی کیوں نہ دیا ہو، اُس میں سے کچھ واپس نہ لینا۔ کیا تم اسے بہتان لگا کر اور صریح ظلم کر کے واپس لو گے؟

حضرت عمرؓ خاموش ہو گئے اور پھر کہا: ''اے عمر، سب لوگ تم سے زیادہ ذی علم ہیں، یہاں تک کہ یہ بوڑھی عورت بھی''۔ اور اس طرح حضرت عمرؓ نے اپنی رائے سے رجوع کر لیا۔

ان دونوں حالتوں میں تجربات کے سامنے عقل کا موقف واضح ہو جاتا ہے۔ پہلی حالت میں نئے ماحول کے زیر اثر عقل ظاہری قید و بند، یعنی الفاظ کی بالادستی سے آزاد ہو جاتی ہے، جو علم کی ترقی کی راہ میں اکثر رکاوٹ بنتی ہے۔ اور دوسری حالت میں حضرت عمرؓ ہٹ دھرمی سے باز رہتے ہیں، جو حقیقت کی اَزلی دشمن اور اس کے حصول کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔

اسلام کی ابتدائی تاریخ میں متعدد ایسی مثالیں ملیں گی، جو قرآن کے زیر اثر نئے تشکیل شدہ عقلی ماحول کی نشان دہی کرتی ہیں، مثلاً حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نہروان کے معرکے کے دوران نجومی کی رائے کی پروا کیے بغیر، اس کے بتائے ہوئے مقررہ وقت کے بجائے قصداً کسی دوسرے وقت جنگ شروع کرتے ہیں اور دشمن پر غالب رہتے ہیں۔ پھر لوگوں سے مخاطب ہوکر فرماتے ہیں: ''اگر ہم نجومی کے بتائے ہوئے وقت پر جنگ شروع کرتے، تو وہ کہتا کہ ہمیں ستاروں کی چال کی بدولت فتح نصیب ہوئی ہے''۔

لیکن دوسرے موقعے پر یہی حضرت علیؓ، زیاد بن النظر کو پرچم دے کر کہتے ہیں: ''تمھیں مجاہدین کی قیادت کرنا ہے۔ ان کے اہلِ علم کے مشورے سے فائدہ اُٹھاؤ اور ان کے جاہلوں کو تعلیم دو''۔

یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ اسلامی فکر اس نئے ماحول میں فرد کے لیے ایک زینہ تیار کرتی ہے، جس کے ذریعے وہ بلندی تک پہنچ سکتا ہے۔ وہ کم علم کو سکھاتا ہے اور ذی علم سے سیکھتا ہے۔ اس طرح علم و معرفت کی یہ برقی رو دونوں رُخ پر دوڑنے لگے گی۔ بسا اوقات یہ رو نیچے سے اُوپر آتی ہے، مثلاً مہر کی حد مقرر کیے جانے کے موقعے پر حضرت عمرؓ کے خلاف عورت کا اعتراض۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اسی زینے کی بدولت فکرِ اسلامی دورِ جاہلیت کی شیئیت (مادیت) سے نکل کر ان بلندیوں تک پہنچی، جہاں سے اس نے تاریک دنیا کو علم کی روشنی سے منور کر دیا۔

آج مستشرقین کی تحریروں میں جب ہم ان بلندیوں کی جھلک دیکھتے ہیں، تو ہماری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جاتی ہیں اور ہم خیال کی وادیوں میں کھو جاتے ہیں۔ لیکن یہی مستشرقین اگر مسلمانوں کے ان علمی کارناموں کا انکار کرتے ہیں، تو ہم احساسِ کمتری میں مبتلا ہوجاتے ہیں۔ دونوں ہی حالتوں میں مستشرقین کی یہ تحریریں ہمارے ذہنوں میں دوطرفہ محرومی کا احساس پیدا کرتی ہیں۔ اس مخمصے سے ہم اسی حالت میں نجات حاصل کر سکتے ہیں، جب ہم قرآن کے تیار کردہ اس زینے کو دیکھیں، جسے طے کر کے انسانی فکر ان علمی کارناموں کی بلندیوں تک پہنچی ہے، جنھیں آج ٹکنالوجی کی ترقی کا بامِ عروج سمجھا جاتا ہے، مثلاً ریاضی کا اعشاری نظام، الجبرا، کیمیا، بائیولوجی کے متعدد اصول، طبیعیات اور فلکیات۔

جب ہم علم کے اس زینے پر نظر ڈالیں، تو ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ اگر اسلامی معاشرہ

چاہے تو یہ علمی زینہ اس وقت بھی اس کے قبضے میں بلکہ اس کے قدموں میں آسکتا ہے۔ ہمیں صرف یہ فیصلہ کرنا ہے کہ اسلامی فکر کی جانب سے انسانیت کے علمی سرمایے میں اضافے کا مسئلہ صرف ان کارناموں پر منحصر نہیں ہے، جنھیں ایک مستشرق اپنی مرضی سے ثابت کرے یا ان کا انکار کرے، بلکہ اِقْرَأْ کے نزول کے بعد سے قرآنی مفہوم کے زیر اثر عقلی فضا اور عقلی ڈھانچے میں جو بنیادی تبدیلی رُونما ہوئی، وہ اس کا حقیقی معیار ہے۔

اس جائزے کی روشنی میں مستشرقین کی تحریروں کے بارے میں اپنے موقف کے تعین کے لیے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اوّلاً ہم مستشرقین کی تحریروں کی علمی قیمت سے انکار نہیں کر سکتے بلکہ بسا اوقات وہ قابلِ ستایش ہوتی ہیں، جیسے سیڈیو، گوسٹاف لوبون اور آسین پلاتھیوس کی تحریریں جو علمی لحاظ سے قابلِ احترام سمجھی جاتی ہیں، اور اخلاقی پہلو کی حامل ہیں۔

● **بنیادی پہلو:** بیسویں صدی کا تمام فکری کام جو تاثیر اور فعالیت کے اعتبار سے اعلیٰ معیار کا قرار دیا جاتا ہے۔ اس کا ایک عملی پہلو بھی ہے، جس سے سیاست اور منفعت پسندی کے میدان میں ناجائز فائدہ بھی اُٹھایا جاسکتا ہے۔ اعلیٰ اور گھٹیا دونوں قسم کی کتابیں پریس سے باہر آتی ہیں۔ بسا اوقات ان کے مصنّفین کی لاعلمی میں، ان ماہرین کے ہاتھوں تک پہنچ جاتی ہیں جو انھیں فکری کش مکش کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ اس طرح وہ ہنگامہ آرائی، اخلاقی بے راہ روی اور صرف توجہ ہٹانے اور بہلانے کا ذریعہ بن جاتی ہیں۔ اس قسم کی کتابیں جب یورپ کے کسی شہر سے شائع ہوتی ہیں، تو اسی وقت کسی عرب دارالحکومت سے اس کا عربی ایڈیشن بھی شائع ہوجاتا ہے۔

اس مطابقت پر ان ملکوں میں بھی توجہ نہیں دی جاتی، جو فکری کش مکش کے ناپسندیدہ اثرات سے دوچار ہیں۔ ان ملکوں کو یہ تک خبر نہیں کہ اس فکری کش مکش کے ذرائع اور مقاصد کیا ہیں؟ بلکہ وہ اس کے مفہوم سے بھی ناآشنا ہیں، گویا ان کے نزدیک 'فکری کش مکش' محض ایک بے معنی لفظ ہو۔

آیئے کسی 'روشن خیال' شخص سے پوچھیں وہ مبہم اور غیر واضح جواب دے گا، ''فکری کش مکش؟ غالباً آپ فلسفۂ وجودیت اور مارکسیت کا ذکر کر رہے ہیں؟'' اگر آپ نے اپنے سوال کی مزید وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ ''نہیں جناب! میں اس مارکسیت کا ذکر کر رہا ہوں، جس کا مارکس سے کوئی تعلق نہیں''۔ یہ محض چند الفاظ اور نعرے ہیں، جنھیں ہمارے نوجوانوں کو اس لیے سکھایا جاتا ہے کہ

ہمارے بعض حکام کے خیال میں مارکسیت کو صرف ایک ذریعہ بنا کر اس سے اسلام کے خلاف کام لیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح اس فلسفۂ وجودیت کو ہمارے وجود سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ یہ اشیا درحقیقت نئی نسل کے ذہنوں پر اثرانداز ہونے کے ذرائع ہیں، جنھیں اس مقصد کے لیے وہ حلقے استعمال کررہے ہیں، جو ان کے فلسفیانہ، فنی یا سماجی پہلو کے خود بھی قائل نہیں ہیں۔ میرا اشارہ ڈائجسٹ قسم کی ان کتابوں کی طرف ہے، جو مفت یا بہت معمولی قیمت پر نوجوانوں میں تقسیم کی جارہی ہیں، تاکہ ان کی جیب پر بوجھ نہ پڑے، اور وہ ضمیر پر اثرانداز ہونے والے ان افکار کو بآسانی قبول کرلیں۔

صد افسوس کہ نام نہاد روشن خیال لوگ اس گفتگو کے مفہوم کو نہیں سمجھ سکتے۔ ان کی نگاہوں پر پردے پڑے ہوئے ہیں۔ ان کے درمیان کوئی قدر مشترک نہیں۔ وہ بزعمِ خود فکری سطح پر ہیں، جہاں غیروں کے افکار کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ ان کا کہنا ہے: ''خیال اپنا اپنا، پسند اپنی اپنی۔ اس پر بحث کی ضرورت نہیں''۔

دوسری طرف غالباً آپ نظریاتی سطح پر ہیں، جہاں ہر نئی فکر کا خوردبین (مائیکروسکوپ) سے تجزیہ کرنا چاہیے، کیونکہ اس سطح پر ایک فکر محض فکر نہیں رہ جاتی جسے صرف فکری یا فنی نقطۂ نظر یا صاحبِ فکر کے عزائم کی روشنی میں دیکھا جائے گا، بلکہ اس فکر کو اسے اپنے مقصد کے لیے استعمال کرنے والوں کے حقیقی عزائم کے اعتبار سے پرکھا جائے گا۔ بہرحال آپ کی باتوں کو وہ لوگ اس لیے نہ سمجھ سکیں گے کہ وہ دنیا کی فکری کش مکش کے مفہوم کو دو بڑی سامراجی طاقتوں کی چپقلش تک محدود رکھتے ہیں۔

زیربحث موضوع کے مطابق ہمیں مستشرقین کی تحریروں کا صرف ان کی ذاتی اور فکری خصوصیات اور عزائم کے نقطۂ نظر سے جائزہ نہیں لینا چاہیے، بلکہ اس پہلو سے بھی دیکھنا چاہیے کہ کون لوگ مستشرقین کی تحریروں کو عالمِ اسلام میں اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرتے ہیں؟

ان مقاصد میں، جیسا کہ ہم پہلے نشان دہی کرچکے ہیں، تسخیرِ عقل وضمیر بھی شامل ہے۔ اسے ہم اس طرح سمجھ سکتے ہیں کہ ہر وہ نظریاتی خلا جہاں ہمارے افکار معدوم ہوں گے، اسے ہمارے مخالف اور دشمن افکار سے پُر کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

یہ ایک عام اصول ہے، جس سے فکری کش مکش کے ماہرین بخوبی واقف ہیں۔ لیکن یہاں

یہ بتادینا ضروری ہے کہ یہ ماہرین محض ایسے دانش ور نہیں ہیں، جو حقیقت برائے حقیقت کی جستجو کررہے ہیں، بلکہ وہ اسے سیاسی مفادات کے میدان میں عملی شکل دینا چاہتے ہیں۔ اس طرح وہ نظریاتی خلا ظاہر ہونے تک کا انتظار نہیں کریں گے تاکہ اسے پُر کرسکیں، بلکہ یہ خلا وہ خود پیدا کریں گے۔ ہوسکتا ہے اس خلا کو عارضی طور پر دوسروں کے افکار سے پُر کردیں تاکہ پہلے مرحلے کے طور پر وہ ہم کو ہمارے افکار سے جدا کرسکیں۔

درحقیقت یہ وہ میدان نہیں ہے کہ جہاں 'خطِ مستقیم' کے اصول کے تحت کام ہوتا ہو۔ صاف سی بات ہے کہ ایک منطقی عمل کا منطقی نتیجہ ہی نکلے گا۔ اس کے برعکس فکری کش مکش کی اپنی ایک علیحدہ منطق ہے۔ عموماً اس کی راہ پُرپیچ ہوتی ہے۔ یہاں ایک مرحلے سے دوسرے مرحلے تک درمیانی اور پُرپیچ راہوں سے پہنچا جاتا ہے۔

مثال کے طور پر یہ نقلی مارکسزم جو بائیں بازو کے خیالات کے حامل ہمارے نوجوانوں کو گھول کر پلائی جارہی ہے، صرف ایک درمیانی مرحلہ ہے۔ جس کا مقصد ہمارے نوجوانوں کے ایک طبقے کو ملک میں نظریاتی محاذ سے علیحدہ کرنا ہے۔ علیحدگی کی اس کارروائی کا ذمہ دار لیڈر، نوجوانوں سے یہ تو کہہ نہیں سکتا کہ ''ہم آپ کے ملک میں ترقی کی رفتار کم کرنا چاہتے ہیں، اس لیے کیا آپ ان افکار و خیالات کی تحریر و تنقیص میں ہماری مدد کریں گے جو ترقی کی اس رفتار کو برقرار رکھے ہوئے ہیں؟'' اس لیے کہ اس قسم کی باتوں کو سراسر یاوہ گوئی اور جنون کہا جائے گا۔ اب اس کے سامنے صرف ایک ہی راہ ہے کہ وہ نوجوانوں کی اس جماعت کو بیرونی افکار کے پُل سے دوسرے کنارے تک لے جائے، جہاں نقلی مارکسسٹ، فریبی قوم پرست اور جعلی انقلاب کے نقاب اُوڑھے ہوئے افراد نظر آئیں گے۔

فکری اور عملی بہروپ کے ان سوداگروں کی اس کارروائی کا پہلا نتیجہ یہ نکلا کہ وطن کا اخلاقی اتحاد ختم ہوگیا، جب کہ آزادی کے بعد کے اہم اور نازک مسائل کا سامنا کرنے کے لیے وطن عزیز کو اس اتحاد کی اشد ضرورت تھی۔ اس کارروائی کے منفی فکری نتائج جس قدر ہمارے نوجوانوں پر، اور سماجی نتائج جس قدر ہمارے معاشرے پر ظاہر ہوں گے، اسی قدر ان مسائل میں کمی کے بجاے اضافہ ہوتا چلا جائے گا۔ اس طرح ان نوجوانوں کی شکل میں، مخصوص فکری کش مکش مسلط کرنے کے

ماہرین کے ہاتھوں میں ہماری نکیل ہوگی ـــــ کتنا بڑا المیہ ہے!

● **ایک شبہہ اور اس کا ازالہ:** ہوسکتا ہے کہ مستشرقین کے حوالے سے زیر بحث موضوع پر ہماری ان باتوں کا بظاہر کوئی تعلق نظر نہ آ رہا ہو، لیکن سچ پوچھیے تو یہ موضوع سے علیحدہ نہیں ہیں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم پوری کارروائی کا مجموعی اور مکمل جائزہ لیں۔ وہ اس طرح کہ فکری کش مکش کے یہ ماہرین ایک طرف نوجوانوں کی ایک جماعت کو دینی شعائر کا مذاق اُڑانے اور اسلام کے مخالف خیالات کا انجکشن دے کر انھیں پاگل کتوں کی طرح بھونکنے کے لیے چھوڑ دیتے ہیں۔ دوسری طرف یہی ماہرین ہمارے نوجوانوں کی ایک دوسری جماعت کو مستشرقین کی تحریروں سے تیار کردہ خواب آور گولیاں مہیا کرنے اور کھلانے کا کام کرتے ہیں۔ اس طرح ہمارے دونوں قسم کے نوجوانوں کے خلاف کارروائی جاری ہے۔ ایک ہیجان انگیزی کے زیر اثر فکری طور پر مفلوج اور دوسرا خواب آور دوا کی وجہ سے فکری طور پر ناکارہ و نامراد۔ ایک ہنگامہ آرائی پر آمادہ اور دوسرا خوابوں کی دنیا میں مست۔ ہمارے خیال میں مسلم دنیا میں فکری کش مکش کے دائرے میں مستشرقین کی تحریروں کا یہی کردار ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ اس دائرے میں ہمارے فکری عمل کی کیا شکل ہونی چاہیے؟ یہاں مجھے یہ کہنے کی اجازت دی جائے کہ تفصیلات کو نظرانداز کر کے صرف اس خیال کی نشان دہی کی جاسکتی ہے، جو زبان زدِ خاص و عام ہے کہ صرف سیاسی آزادی کا حصول ہی کافی نہیں، اسے معاشی آزادی کے ذریعے مستحکم کرنا بھی ضروری ہے۔

یہ بات اپنی جگہ صحیح ہے لیکن ہم اس میں اتنا اضافہ کرنا چاہیں گے کہ جو معاشرہ اپنے بنیادی افکار خود وضع نہیں کرتا، وہ نہ تو ضروریاتِ زندگی کی اشیا تیار کرسکتا ہے اور نہ صنعت کاری کے لیے لازمی مصنوعات۔ ایک زیرتعمیر معاشرہ درآمد شدہ افکار سے تعمیر نہیں کیا جاسکتا، خواہ یہ افکار استشراق سے ماخوذ ہوں یا اشتراکیت اور وجودیت سے۔ اسے کتابوں کے بجاے عملی تجربے سے اپنی راہ نکالنی ہے۔ اسی طرح ہمیں بھی اپنا ذاتی تجربہ حاصل کرنا چاہیے اور اپنے دائرۂ فکر و عمل کا تعین خود کرنا چاہیے نہ کہ کسی اور کی طرف سے ہمارے لیے متعین کیا جائے۔ آخری بات یہ کہ عقیدے اور فکر کے میدان میں اپنا حقیقی وجود، اور آزادی بحال کر کے ہی ہم معاشی اور سیاسی آزادی حاصل کر سکتے ہیں۔